مولانا محمد حنیف ندوی

دینی اور لادینی علوم

اسلام زندگی کو دینی اور لادینی دو خانوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک زندگی کا ہر وہ اسلوب، ہر وہ عمل اور ہر وہ نہج دینی ہے، جس کو رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ٹھہرایا جائے۔ یہ ایک جامع مذہب ہے جس میں ہر وہ تگ و دو اور سعی و کوشش داخل ہے، جو انسانی فکر کو نکھارے، اخلاق و کردار میں حسن و جمال پیدا کرے، انسانی رشتوں میں عدل و انصاف کے پیمانوں کو رائج کرے اور دلوں میں تقویٰ، خدا ترسی اور پاکیزگی کے عوامل کو ابھارے۔ اسلام توحید کا علم بردار ہے، اس لیے قدرتی طور پر اس کا مقصد یہ ہے کہ دین و دنیا کی تفریق زندگی میں ثنویت یا دوئی کو پنپنے کا موقع نہ دے۔ زندگی ایک 'کل' ہے، اس کے اجزا ہو سکتے ہیں اور اس کو مختلف انواع اور شاخوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ انواع اور شاخیں کل کے ساتھ ہم آہنگ نہیں۔ یا اس کے اجزا میں کوئی حقیقی تناقض پایا جاتا ہے۔

علوم چونکہ ہماری فکری و عملی زندگی ہی کا ایک اہم حصہ یا اساس ہیں، اس لیے اسلامی نقطۂ نظر سے ان میں بھی فرق و امتیاز کی یہ نوعیت کارفرما نہیں کہ ان میں بعض علوم تو دینی ہیں اور بعض لادینی۔ علم روشنی ہے، برکت ہے اور ہدایت و رہنمائی کا ایک سرچشمہ ہے۔ یہ کسی بھی دریچے سے جھانکنے اور کسی بھی ذریعے اور عنوان سے حاصل ہو، روشنی ہی رہے گی اور برکت و ہدایت اس کا خاصا رہے گا۔ عقل و دین لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح وحی و تنزیل کے انوار انسانی زندگی کی تاریکیوں کو اجالوں سے بدل دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اسی طرح عقل کی ضیا افروزیوں سے نہ صرف قلب و ذہن کے اندھیرے دور ہوتے ہیں، بلکہ ان عقائد و تصورات کی تائید و توثیق کا سامان بھی فراہم ہوتا ہے جو ہمارے ایمانیات کی اساس اور بنیاد ہیں۔ دین کے مضمرات میں عقل و خرد کے تقاضے اسی طرح جاری و ساری ہیں، جس طرح جسم میں خون یا گلوں اور پھولوں میں مہک اور خوشبو۔ اور عقل کے تمام تر نتائج و ثمرات بعینہٖ اسی سچائی اور صداقت پر دلالت کناں ہیں جن کی وحی و تنزیل کے ذریعے

نشان دہی کی گئی ہے۔

ان میں فرق و اختلاف یا تناقض و تضاد اُس وقت اُبھرتا ہے جب ان میں کسی ایک کی غلط ترجمانی کی جائے یعنی اگر دین کی صحیح صحیح تعبیر کی جائے اور عقل و خرد کے نتائج و ثمرات کے استنباط میں دیانتداری اور حزم و احتیاط کو پوری ملحوظ رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ ایک دوسرے کی تائید نہ کریں یا ایک دوسرے کے اکتشافات پر مہر تصدیق ثبت نہ کریں۔ علامہ ابن تیمیہ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ نصوص دینی اور تصریحات عقلی میں اگر کہیں تصادم رونما ہو تو وہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو نصوص کے سمجھنے میں گھپلا ہے اور یا پھر فکر و تعقل کے عمل میں کہیں تعصب، ضد اور جہل نے صحیح نتیجہ اخذ کرنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔

عقل و دین میں اس بنا پر ایک ازلی رشتۂ مودت و توافق استوار ہے کہ دونوں کا ماخذ اور سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی ہے، اس کی حکمت و دانائی کا پرتو انسانی عقل ہے اور اس کی ربوبیت کا فیضان وحی و تنزیل۔

مختلف علوم چونکہ عقل و دانش ہی کے پروردہ ہیں اس لیے دین کے ساتھ ان کی کوئی پرخاش نہیں۔ یہ اپنے موضوع اور غرض و غایت کے لحاظ سے بالکل غیر جانب دار ہیں۔ نہ ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ یکسر دینی ہیں اور نہ یہ کہنا درست ہے کہ یہ قطعی دین کے خلاف ہیں۔ یہ فلکیات، طبیعیات، حیاتیات، نفسیات اور اجتماعی معارف کے الگ الگ میدانوں میں مصروفِ تحقیق ہیں۔ دین کی تصریحات میں اور ان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ جہاں دین نے اپنے دامن میں قطعیات کو سمیٹ رکھا ہے، وہاں ان میں غور و فکر اور مراجعہ کا عمل ابھی جاری ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ یہ عمل کب اور کن نقاط پر جا کر اختتام پذیر ہو گا۔

اس وضاحت کے بعد دینی علوم اور لادینی علوم کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ علوم جو براہِ راست دینی ماخذ سے متعلق ہیں، دینی ہیں اور وہ جن کا دائرۂ کار دین سے الگ اور علیحدہ ہے لادینی ہیں۔

اس سے پہلے کہ دینی علوم و ماخذ سے متعلق ہم اپنی رائے کا اظہار کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہی قدم پر یہ بتا دیں کہ علوم دینی اور غیر دینی علوم میں بعض دانشوروں نے ازراہِ تعصب خواہ مخواہ جو بُعد و تناقض کی دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں وہ صحیح نہیں تاکہ ہمارا یہ دعویٰ حق بجانب نظر آئے کہ عقل و دین میں دو توام اور سگے بھائی بہنوں کا سا رشتہ ہے لیکن یار لوگوں نے بلاوجہ ان میں بگاڑ پیدا کرنے کی مذموم کوشش کی ہے، ورنہ اصل میں ان دونوں میں پوری طرح یگانگت اور توافق پایا جاتا ہے۔

سرے دست ہم طبیعیات اور نفسیات کے نتائجِ فکر کا ہلکا پھلکا جائزہ لیں گے اور بتائیں گے کہ یہ دعویٰ درست نہیں کہ ان سے تحقیق و تفحص کے ایسے نتائج اخذ ہوتے ہیں جو دینی مسلمات کے خلاف ہیں۔

یوں تو موجودہ علوم کی ہر ہر شاخ میں لوگوں نے شک و ارتیاب کے رخنے ڈھونڈے ہیں لیکن طبیعیات اور نفسیات چونکہ دو ایسے علم ہیں جنھیں خصوصیت سے دہریت و الحاد کی تائید و توثیق کے لیے کام میں لایا جاتا ہے، اس لیے آئیے ان دونوں پر غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ ان سے کہاں تک ملاحدہ کی مطلب برآری ہوتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے آغاز تک طبیعیات کے ماہرین نے اس فن میں وہ حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں اور کائنات کے اسرار و رموز کی اس طرح پردہ کشائی کی کہ جس سے ایک طرف تو ان میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور دوسری طرف ان کے ذہنوں میں یہ خیال ابھرا کہ یہ سارا کارخانہ ہست و بود محض سررشتۂ علت و معلول کا رہین منت ہے اور مادی عوامل و موثرات ہی دراصل وہ شے ہے جن کے فعل اور رد فعل سے، حرکت سے لے کر زندگی تک اور زندگی سے لے کر شعور و ادراک تک کی سب منزلیں آپ سے آپ طے ہوتی چلی جاتی ہیں، اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تصور و عقیدہ کو بیچ میں لائے بغیر اس عالمِ رنگ و بو کی گتھیوں کو سلجھایا جا سکے۔ چنانچہ اس کے بعد طبیعیات کے ماہرین کے حلقوں میں جو کاوشیں ہوئیں وہ اسی مفروضے کو مان کر ہوئیں۔

لیکن یہ کاوشیں یک طرفہ تھیں۔ مشیتِ ایزدی کا تقاضا یہ تھا کہ انسان زیادہ دیر تک گمراہی کے ان اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں نہ مارتا پھرے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ اسی منحرف گروہ کی کوششوں سے ایٹمی نظریے کی تفصیلات فکر و نظر کا موضوع بنیں اور تحقیق و تفحص سے معلوم ہوا کہ علت و معلول کا جو حصار کائنات مادی میں اتنا استوار اور محکم نظر آتا تھا یہاں ریزہ ریزہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ ایٹم کے دائرے میں جو کہربائیے حرکت کناں ہیں اور جن کی حرکت سے جسمیہ، حیات اور شعور کروٹ لیتا رہا ہے، وہ حرکت بجائے خود کسی علت کی تابع نہیں اور کسی قاعدہ اور قانون کی مرہونِ منت نہیں۔ لہٰذا یا تو یہ مان لیا جائے کہ ایٹم میں تخلیق و آفرینش وجود کی جو صلاحیتیں پائی جاتی ہیں وہ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہیں، اور یا پھر یہ کہا جائے کہ ان کو نظم و ارتباط کے سانچوں میں ڈھالنے والی کوئی دوسری ذات ہے، جو بے نظیر علم اور بے مثل حکمت اور بے پناہ قدرت کی حامل ہے۔ ظاہر ہے کہ محض بخت و اتفاق کو اس مربوط اور بامقصد

کائنات کی اساس نہیں قرار دیا جاسکتا، اس لیے ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ کے عقیدے کو نظر انداز کرنا نہ صرف گمراہی ہے بلکہ خود اپنے علم و آگاہی کی تکذیب کے مترادف ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی، آگے چل کر خود علّت کے بارے میں یہ حقیقت نکھر کر سامنے آئی کہ یہ کسی ایک عنصر یا حقیقت سے تعبیر نہیں، بلکہ جسے ہم علّت کہتے ہیں یہ ارتقا و تغیر کا ایک طویل اور مسلسل عمل ہے جو اپنے آغوش میں ایسے ناگہانی اور ناقابلِ توجیہ عوارض کو لیے ہوتے ہے جو پہلے سے موجود نہیں ہوتے۔ مثلاً آم ہی کو لیجیے، اس کی شکل و صورت، اس کا مزہ و کیف اور خاص طرح کی عذوبت و شیرینی آم کی گٹھلی یا قلم میں کسی مقدار میں بھی پائی نہیں جاتی اور کوئی باریک سے باریک تجزیہ بھی ان خصوصیات کی نشان دہی نہیں کر پاتا جن کی وجہ سے آم آم ہے، کھجور نہیں۔ یہ تمام عوارض، اس کے ارتقا و تغیر اور نشوونما کے اثنا میں حکمتِ الٰہی سے لاحق ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تاآنکہ یہ اس قابل ہو جائے کہ کام و دہن اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ نظامِ کائنات پر اس طرح غور کیجیے گا تو معلوم ہوگا، اس میں قدم قدم پر ایسے شواہد پائے جاتے ہیں جو دینی عقائد کی تائید کرتے ہیں۔

طبیعیات کے بارے میں اس مختصر سے لمحۂ فکریہ کے بعد آئیے اب ان شکوک و شبہات پر ایک نظر ڈالتے چلیں جو نفسیات کی راہ سے نہاں خانۂ قلب و ذہن میں جاگزیں ہوتے ہیں۔

نفسیات کا علم ابھی نیا نیا ہے، اس کا موضوع ذہنِ انسانی کا مطالعہ و تحقیق ہے۔ یہ علم یہ جاننا چاہتا ہے کہ انسان کا ارادہ و عمل کن داخلی و خارجی موثرات کے تحت معرضِ ظہور میں آتا ہے۔ نفسیات کے ماہرین نے ذہن کو دو متعین حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک تحت الشعور اور ایک شعور، تحت الشعور خواہشات، تاثرات، جذبات اور ناتمام رجحانات کا ایک غیر مرتب ملغوبہ ہے۔ نفسیات کے بعض علما کی یہ رائے ہے کہ فکر، شعور اور ارادے کا اپنا کوئی وجود نہیں۔ یہ سب تحت الشعور کا کرشمہ ہے۔ اسی کی کوکھ سے یہ سب حقائق جنم لیتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جسے ہم حریتِ ارادہ اور اختیار کہتے ہیں، یہ محض ہمارا پندار ہے کہ گو ہم جبر و اضطرار کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں تاہم یہی سمجھے جا رہے ہیں کہ ہم اپنے اعمال و ارادے میں آزاد اور خود مختار ہیں۔

سلوکی مدرسۂ فکر کے حامی تو فکر و ارادہ کی جنبشوں کو اس سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے کہ یہ محض ذہن کے عوامل داخلی و خارجی کا لازمی نتیجہ ہیں۔ ایک صاحب اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ

فکر و شعور ذہن کا فضلہ ہے، اس سے زیادہ اس کی اور کوئی حیثیت نہیں۔ یعنی انسانی ذہن کا عمل اسی طرح میکانکی اور طبعی ہے جس طرح معدہ، جگر اور قلب کا عمل۔

نفسیات کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ ابھی اس نے باقاعدہ علم یا سائنس کی شکل اختیار نہیں کی، اس لیے اس کے اخذ کردہ نتائج بھی سائنسی حقائق کے دائرے میں نہیں آتے۔ ارادہ و شعور کی حیثیت کا تعین دراصل اس سوال کے جواب پر موقوف ہے کہ ہم تحت الشعور اور شعور میں رشتہ و تعلق کی کس نوعیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ کیا ان میں ٹھیٹھ علت و معلول کا تعلق ہے یا تعلق کی ایسی نوعیت کارفرما ہے جو ایک شاعر اور الفاظ و حروف میں پائی جاتی ہے یا ایک مصور اور اس کے رنگ و روغن اور موقلم کے مابین قائم ہے۔ یعنی شعور، لاشعور سے کچھ چیزیں حاصل تو کرتا ہے، لیکن ان کو اس انداز سے خود ترتیب دیتا ہے کہ فکر و تصور کی رنگینیاں معرضِ ظہور میں آتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک شاعر الفاظ و حروف کو چنتا ہے اور پھر ان کو شعر کے قالب میں ڈھال دیتا ہے، اور جس طرح ایک مصوّر رنگ و روغن اور موقلم کا انتخاب کرتا ہے اور ان کی مدد سے ایک حسین و جمیل مرقع تیار کر دیتا ہے، بعینہٖ اسی طرح شعور، تحت الشعور سے جو موادِ خام حاصل کرتا ہے اس کو اپنی ہنرمندانہ قوتِ تخلیق سے فکر و اندیشے کی معجز طرازیوں میں بدل دیتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں شعور فعّال اور خلّاق ہے، جو فلسفہ و علوم اور تہذیب و ثقافت کی بوقلمونیوں کو جنم دیتا ہے، جو قانونِ فطرت کی تسخیر کرتا ہے اور ماہ و مشتری پر فتح و نصرت کے پرچم لہراتا ہے۔ اسے مجہول، بے تاثیر ٹھہرانا اور محض ذہن کا میکانکی اور طبعی عمل قرار دینا علمی زیادتی ہی نہیں انسانی فکر و عظمت کی توہین بھی ہے۔ اس بحث میں مزے کی بات تو یہ ہے کہ مذہب تو انسان کو مکلف، خود مختار اور آزاد مانتا ہے، حالانکہ ان کے خیال میں ہمیشہ یہ رجعت پسندانہ رجحانات کا حامل رہا ہے اور یہ ترقی پسندانہ نفسیات کے ماہرین بیسویں صدی کی روشنی میں اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ انسان کو مجبورِ محض ثابت کریں۔

● یہ صحیح ہے کہ نفسیات کے ماہرین کی اکثریت کا رجحان اسی طرف ہے کہ انسان کو ارادہ و شعور کی حد تک مجبور ہی تصور کیا جائے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ جب علم و تحقیق کی کاوشوں میں ذرا گہرائی اور پختگی آئے گی انھیں ماننا پڑے گا کہ جس طرح مادے کی ادنیٰ سطح ذرہ میں تعلیل و تسبب کا قانون بے کار ہو جاتا ہے، اسی طرح مادے کی اس اعلیٰ سطح ذہنِ انسانی میں بھی یہ قانون چلنے والا نہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم علومِ دینی کی وضاحت کریں حضراتِ علما کو ازراہِ اخلاص مشورہ دیں گے کہ وہ ان تمام علوم کا مطالعہ کریں جن کو لادینی سمجھ کر انھوں نے ترک کر رکھا ہے، اور جہاں جہاں سے ان کو روشنی ملے یا تائید حاصل ہو، اس کو اپنے دامنِ طلب میں سمیٹیں اور دینِ حق کی محکمی و استواری کو ثابت کرنے کے لیے اس سے کام لیں۔

دینی علوم کون کون ہیں؟ اس سوال کا جواب ہر کوئی جانتا ہے۔ اسلامی حلقوں میں یہ جانی بوجھی حقیقت ہے کہ علومِ دینی کا براہِ راست تعلق تین چیزوں سے ہے۔ قرآن سے، حدیث سے اور فقہ سے۔

قرآنِ حکیم اللہ تعالیٰ کی وہ پہلی و آخری کتاب ہے، جس نے نوعِ انسانی کی فکری و عملی زندگی کے تمام پہلوؤں کو نکھارا اور واضح کیا۔ دین و دنیا کی دوئی کو ختم کیا۔ جس نے رہبانیت کو بدعت ٹھہرایا اور زندگی کے احترام پر زور دیا۔ جس نے توحید کا جیتا جاگتا اور روشن تصور پیش کیا، جس نے علم کا رتبہ بڑھایا، غور و تدبر اور فکر و نظر پر انسان کو آمادہ کیا۔ جس نے عدل کے قیام کو اجتماعی زندگی کا ضروری جز قرار دیا، جس نے علم و آگاہی کے نئے نئے دریچوں کو وا کیا اور معاشرے میں نیکی، تقویٰ اور تعلق باللہ کے فیوض و برکات کا چرچا کیا۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بھی دنیا کی پہلی اور آخری کتاب ہے کہ جس قدر اس نے انسانی ذہن و فکر کو متاثر کیا ہے اور کوئی کتاب اس بارے میں اس کی حریف نہیں ہو سکتی۔

یہ کتابِ حکیم ۱۱۴ سورتوں پر مشتمل ہے جو مختصر بھی ہیں اور طویل بھی، اور ان میں کی ہر سورۃ اپنے اندر معارف و معانی کا ایک سمندر لیے ہوئے ہے۔ یہ کہنے کو ایک کتاب ہے، لیکن متعدد علوم و فنون پر مشتمل۔ اس میں عقائد بھی ہیں، عبادات بھی ہیں۔ تاریخ اقوام بھی ہے، زندگی کا اسلوب و نہج بھی ہے، اخلاق و سیرت کی تابندگی بھی ہے، کائنات کے بارے میں واضح نظریہ اور تصور بھی ہے۔ اس حقیقت کا بیان بھی ہے کہ زندگی کا قافلہ رواں دواں ہے اور موت کی حیثیت محض ایک وقفے کی ہے۔

اس کا ایک ایک شوشہ اور نقطہ محفوظ ہے، اس کے الفاظ بھی حجیت و استناد کے حامل ہیں اور معانی بھی۔ اس کی بدولت متعدد علوم مدون ہوئے اور ہر ہر دور میں متعدد حضرات نے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ کسی نے اس کی نحو ترتیب دی، کسی نے اس کی آیات کی شانِ نزول پر بحث کی، کسی نے اس کے مفردات الفاظ کی تشریح کی، کسی نے احادیث و روایات کی روشنی میں اس کی تفسیر بیان کی، کسی نے اس کے ادبی اسلوب کو واضح کیا، کسی نے اس کے محکمات و متشابہات پر قلم اٹھایا، کسی نے مکی و مدنی سورتوں

کی تفصیل سے تعرض کیا، کسی نے اس کے اعراب و تشکیل پر بحث کی اور کسی نے اس میں حکم و معارف کی نشاندہی کی اور یہ بتایا کہ یہ کتاب ہدیٰ اپنے جلو میں کن کن نوادر و نکات کو لیے ہوتے ہے۔ غرض اس کی تشریح و تفسیر کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر ہمارے اسلاف نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ لیکن یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس کے باوجود حقائق و معانی کا یہ بحرِ مواج ابھی پایاب نہیں ہوا۔ اس کی تہہ میں اب بھی جواہر و آلی کا ایک خزینہ پنہاں ہے۔ یہی نہیں اس کے آفاق پر حکمت و فلسفہ کے سینکڑوں آفتاب ایسے ہیں جو ہنوز جلوہ گری کے لیے بے تاب و بے قرار ہیں۔

حدیث، شریعتِ اسلامی کا دوسرا ماخذ و منبع ہے۔ اس کا آغاز اسی وقت سے ہو گیا تھا، جب قرآن حکیم نازل ہونا شروع ہوا۔ آنحضرتؐ چونکہ اللہ کے آخری پیغمبر اور نبی تھے اس لیے ضروری تھا کہ وہ اس پیغام کو لوگوں تک کھول کر پہنچائیں جس پر اسلامی دنیا کی فلاح و نجات کا مدار تھا۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے عمل سے، قول سے اور تقریر سے اس کی تبیین و تفسیر کا فریضہ انجام دیا۔ یہی نہیں، عملاً ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جو قرآنِ حکیم کی تعلمات پر عمل پیرا تھا۔

حدیث کی باقاعدہ تدوین اگرچہ تیسری صدی میں ہو پائی۔ لیکن خود عصرِ نبوت ہی میں اس کی حفاظت و صیانت کا پورا پورا اہتمام کر لیا گیا تھا۔ آنحضرتؐ کے ایک ایک قول اور فعل کو صحابہ یاد رکھتے تھے، اس پر عمل کرتے تھے اور مختلف مسائل کے حل و کشود کے سلسلے میں اس سے مدد لیتے تھے، آنحضرتؐ کے مقرر کردہ مبلغین اور عمال، مختلف بلادِ اسلامی میں لوگوں کو بتاتے تھے کہ آنحضرتؐ نماز کیونکر پڑھتے تھے مناسکِ حج کیوں کر ادا کرتے تھے۔ زکوٰۃ کے لیے کن احکام و اوامر کی تلقین کرتے تھے۔ تاریخِ تدوینِ احادیث سے اس بات کا پتا بھی چلتا ہے کہ حدیثِ رسول پر نہ صرف لوگوں نے عمل کیا، اسے یاد رکھا اور لوگوں تک پہنچایا بلکہ اُسے قلم بند بھی کیا۔ میثاقِ مدینہ اور وہ مکتوباتِ گرامی جو آنحضرتؐ نے اپنے دور کے سلاطین و ملوک کو بھیجے اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔

صحابہ کرام نے احادیث کی تبلیغ و اشاعت اور اس کی طلب و جستجو کے لیے کیا کیا سختیاں برداشت کیں، کتبِ تاریخ و سیر میں اس کے متعدد شواہد ملتے ہیں۔ چنانچہ ابو ایوب انصاری کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے صرف ایک حدیث معلوم کرنے کے لیے حجاز سے مصر تک کی طویل مسافت طے کی۔ اسی انداز سے تابعین اور تبع تابعین نے اس حرفِ شیریں کو آگے بڑھایا۔ تا آنکہ یہ خزینۂ علم و حکمت بحفاظت تمام صحاح ستہ کی شکل میں مدون ہوا،

جس طرح قرآنِ حکیم نے نئے نئے علوم کو جنم دیا اسی طرح احادیث کی بدولت علم الاسناد، اسماء الرجال، علل، تطبیق اور مدارجِ احادیث کی صورت میں بیسیوں علوم معرضِ تدوین میں آئے۔ یہی نہیں محدثین نے احادیث کی جانچ پرکھ کے لیے ایسے پیمانوں کو بھی وضع کیا جو ہر لحاظ سے جامع اور مکمل تھے اور کسی لحاظ سے بھی نقد و تفحص کے ان پیمانوں سے کم درجے کے نہیں تھے جن کو مغرب "تنقیدات عالیہ" کے پرشکوہ الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔

فقہ، وہ علم ہے جس کی وجہ سے قرآن و سنت کے ذخائر نے ایک مربوط نظامِ حیات کی شکل اختیار کی۔ ائمۂ اجتہاد نے جب یہ دیکھا کہ اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے اور نئے نئے مسائل رونما ہو رہے ہیں تو انھوں نے نہایت دقتِ نظر سے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اس ضرورت کو محسوس کیا کہ قرآن و سنت کو قانون کے نپے تُلے سانچوں میں ڈھالنا چاہیے اور لوگوں کو بتانا چاہیے کہ اسلام کا اسلوبِ زیست، عبادات، مناکحات اور معاملات میں کن کن متعین مسائل و جزئیات کی تشریح کرتا ہے۔

فقہ و تقنین کا یہ عمل دوسری صدی ہجری سے شروع ہوا اور تیسری صدی میں ترتیب و تدوین کے اس مرحلے تک پہنچا کہ جس میں مختلف فقہی مدارس اپنے اپنے حلقوں میں قبولیت و پذیرائی کی نعمت سے بہرہ مند ہوئے۔ اس دور میں تقنین و اجتہاد کی کوششوں میں اگرچہ متعدد فقہا اور ائمہ نے حصہ لیا لیکن جن فقہی مدارس کو محدثین کے علاوہ عالمِ اسلامی میں عموماً فروغ حاصل ہوا، وہ صرف چار ہیں۔ فقہ حنفی، فقہ مالکی، فقہ شافعی، اور فقہ حنبلی۔

فقہ و تقنین کا یہ ذخیرۂ علمی جو ہمارے اسلاف کے ذریعے ہم تک پہنچا اتنا اہم، قابلِ قدر اور عظیم ہے کہ ہم اس پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ یہ اپنی وسعت اور استواری و محکمی کے اعتبار سے دنیا کے ہر ذخیرۂ قانون سے بہتر اور افضل ہے۔ جہاں تک اصل ماخذِ دینی کا تعلق ہے اس کا اطلاق بغیر کسی اختلافِ رائے کے صرف کتاب و سنت پر ہوتا ہے، فقہ اسلامی کی حیثیت اس مبارک عمل اور جد و جہد کی ہے جو ماضی میں اس بنا پر بروئے کار آئی کہ کتاب و سنت کی نصوص کو حتی المقدور ایک قانونی سلک میں منسلک کیا جائے، اور یہ عملِ انسلاک نہ صرف ہر دور میں جاری رہا بلکہ اس دور میں بھی اس کی ضرورت و اہمیت کو شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب ہم اس لائق ہو جائیں گے کہ موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق، فقہ جدید کی تشکیل کریں اور ثابت کر دیں کہ اسلام کا پیغام زمان و مکان کی حد بندیوں سے بے نیاز ہے اور اس میں یہ صلاحیت اور لچک ہے کہ ہر ہر عصر کے اجتماعی، اقتصادی اور عمرانی تقاضوں کا تسلی بخش جواب دے سکے۔